© rasailojaraid.com

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

تقسیم کے بعد

(۱۶)

از سعید احمد اکبر آبادی

فیکلٹی آف تھیالوجی کی ڈین شپ کا معاملہ!

کورٹ کی اسی میٹنگ (۲۵ر اپریل ۱۹۶۵ء) میں ایک ایسا رزولیوشن بھی منظور ہوا جس کا اثر براہ راست مجھ پر پڑتا تھا۔ یہ بھی ایک دلچسپ روئداد ہے، آپ بھی سن لیجیے: یونیورسٹی میں پہلے سے یہ قاعدہ چلا آرہا تھا کہ جن شعبوں میں پروفیسر موجود ہوں گے وہ باری باری سے دو برس کے لئے اپنی فیکلٹی کے ڈین ہوں گے، لیکن جن شعبوں میں پروفیسر نہیں بلکہ ریڈر ہوں گے ان میں سے جو سینیر ریڈر ہوگا وہ فیکلٹی کا ڈین مستقل طور پر ہوگا اور جونیر ریڈر کبھی ڈین نہیں ہوگا۔ یہ قاعدہ یونیورسٹی کے دستور کی دفعہ (A) 18 کے ماتحت تھا۔ اور چونکہ فیکلٹی آف تھیالوجی میں اس وقت تک کوئی پروفیسر نہیں تھا اور سینیر ریڈر میں ہی تھا اس بنا پر اس دفعہ کی روشنی میں میں ہی مستقل ڈین تھا۔ مولانا سید علی نقی صاحب نقوی صدر شعبہ دینیات کے لئے ڈین ہونے کا کوئی موقع نہیں تھا اور زیدی صاحب اس کا حکم دے بھی چکے تھے۔ لیکن ۶۲ء کے عام انتخابات پارلیمنٹ و اسمبلی کے موقع پر ایسا ہوا کہ جرار حیدر صاحب ایڈوکیٹ جو یونیورسٹی کے مشیر قانونی بھی تھے وہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اتر پردیش اسمبلی کے لئے کانگرس کے ٹکٹ پر امیدوار تھے اور یونیورسٹی کا ترقی پسند طبقہ بڑے جوش وخروش کے ساتھ ان کا حامی تھا۔ ان کے مقابلہ پر میرے مرحوم دوست ڈاکٹر محمد عبدالبصیر ریپبلکن پارٹی کے ٹکٹ پر اس سیٹ کے امیدوار کھڑے ہوئے تھے میں مرحوم کا حامی تھا اور میری وجہ سے مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ بھی ان کا حامی ہوگیا تھا۔ اور مسلمانوں نے اس سلسلہ میں غیر معمولی جوش وخروش اور کانگرس کے خلاف اپنی بیزاری کا مظاہرہ کیا تھا۔

میں اگرچہ اصولاً کانگرس کا حامی رہا ہوں اور ہمیشہ اسی کو ووٹ دیتے ہیں، لیکن مسلسل فسادات اور اس سلسلہ میں حکومت کی بےعملی اور نااہلیت کا مجھ پر بھی اس درجہ اثر تھا کہ اپنے اس اصول کے خلاف میں نے دونوں سیٹوں پر ریپبلکن پارٹی کے امیدواروں کو ووٹ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور علانیہ اس کا اظہار بھی کردیا تھا۔ جرار حیدر صاحب اور ان کے ساتھیوں کو میرا یہ فیصلہ سخت ناگوار تھا۔ ان کے بعض حامیوں نے جن میں بعض میرے عزیز دوست بھی تھے ہر چند کوشش کی کہ میں اپنا رویہ بدل دوں۔ لیکن جب میں نے ان کو مایوس کردیا اور ادھر الکشن میں ڈاکٹر عبدالبصیر نہایت شاندار طریقہ پر عظیم اکثریت سے کامیاب ہوگئے اور ان کے حریف جرار حیدر صاحب بہت بری طرح ناکام رہے تو ان کے دلوں میں میرے خلاف سخت غیض وغضب پیدا ہوگیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس واقعہ کے بعد یونیورسٹی کورٹ کی جو پہلی میٹنگ ہوئی اس میں جرار حیدر صاحب (جو پہلے سے کورٹ کے ممبر تھے ہی) نے مذکورہ بالا دفعہ (A) 8 میں ترمیم کی تجویز پیش کردی جس کا مقصد یہ تھا کہ ڈین شپ پروفیسروں کی طرح ریڈروں میں بھی دائر سائر رہے۔

مجھ کو اللہ تعالیٰ نے ان معاملات میں بڑا بے نیاز بنایا ہے، عہدہ اور منصب کی خواہش سے طبیعت ہمیشہ گریزاں رہی ہے، اس بنا پر کورٹ کی میٹنگ کے ایجنڈا میں جب میں نے یہ تجویز دیکھی تو یہ خیال تو ضرور ہوا کہ مجھ سے انتقام لیا جارہا ہے، لیکن میں نے اس کو قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی، یہاں تک کہ مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب مرحوم اور مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی دونوں کورٹ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بر تھے میں نے ان سے بھی اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میٹنگ میں یہ رزولیوشن
رحیدر صاحب نے ایک پرزور تقریر کے ساتھ پیش کیا، متعدد حضرات نے اس کی تائید میں
یریں کیں اور یہ تجویز منظور ہو گئی۔

قاعدہ کے مطابق اب اس تجویز کو مزید غور و فکر اور منظوری کے لئے اکزکٹو کونسل کے سامنے
ش ہونا چاہئے تھا۔ لیکن زیدی صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ دفعہ (A) ۱۸ میں ترمیم کا مقصد
ر آبادی سے انتقام لینے کے سوا کچھ اور نہ تھا اور انھیں اس بات کا بھی یقین تھا کہ مولانا
ید علی نقی النقوی اپنے علم و فضل کے باوجود انگریزی سے ناواقفیت اور یونیورسٹی ایجوکیشن اور
منسٹریشن سے اجنبیت کے باعث ڈین شپ کا کام خاطر خواہ طور پر انجام نہیں دے سکیں گے
س بنا پر وہ اس کو پی کر بیٹھ گئے اور اکزکٹو کونسل کے سامنے اس کو نہیں رکھا یہاں تک کہ وہ
پنے عہدہ سے سبکدوش ہو کر دہلی چلے گئے، میں ۱۹۶۲ء میں کنیڈا چلا گیا اور میری جگہ مولانا سید
نقی صاحب ڈین ہو گئے۔ جب میں ایک برس کے بعد کنیڈا سے واپس آیا تو مجھے یہ معلوم
ر کے حیرت ہوئی کہ کورٹ کی منظور کی ہوئی وہ تجویز اب تک کھٹائی میں پڑی ہوئی ہے اور
ز کٹو کونسل کے سامنے پیش نہیں ہوئی، چنانچہ میں اب پھر ڈین ہو گیا، زیدی صاحب کے
ند بدرالدین طیب جی آئے، ان کے عہد میں بھی یہ تجویز یوں ہی پڑی رہی۔ لیکن اکزکٹو کونسل
ی وہ میٹنگ جو موصوف کے عہد کی آخری میٹنگ تھی اس کے ایجنڈہ میں یہ تجویز موجود تھی۔ اس
یٹنگ میں میں خود موجود تھا۔ جب بدرالدین طیب جی ایجنڈہ کی اس دفعہ پر پہونچے تو انھوں نے
س پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر منہ اٹھا کر فرمایا: "کورٹ نے یہ ترمیم ۱۹۶۲ء کے شروع میں منظور کی تھی
یکن اس وقت سے اب تک (۱۹۶۴ء کا آخر) یہ یوں ہی پڑی رہی اور اکزکٹو کونسل کے ایجنڈہ
پر نہیں آئی! معلوم نہیں یہ کیسے ہوا؟" اس کے بعد ذرا اپنی آواز کو بلند کر کے اور اپنی بات پر زور
ے کر فرمایا: "اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اور اس کا مقصد کیا ہے؟
یونکہ پوری یونیورسٹی میں اس کا اطلاق مولانا اکبر آبادی کے علاوہ اور کسی پر نہیں ہوتا۔" بعض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ممبروں نے اس کے خلاف بولنا چاہا مگر میں نے اشارہ سے ان کو منع کر دیا اور کہا کہ چلنے دیجئے، اس میں مضائقہ ہی کیا ہے؟ بدر الدین طیب جی کچھ دیر خاموش رہے اور پھر بولے: "چونکہ یہ تجویز کوٹ میں مجھ سے پہلے کی ہے اس لئے میں خود کچھ نہیں کہہ سکتا ہوں" اس کے بعد یہ تجویز منظور ہوگئی، اب قاعدہ کے مطابق اسے پھر کورٹ کی میٹنگ میں آنا تھا، چنانچہ نواب علی یاور جنگ کے چارج لینے کے بعد وہی ۲۵ر اپریل ۶۵ء کو کورٹ کی جو میٹنگ ہوئی اور جس میں یہ سب کچھ ہنگامہ ہوا اسی کے ایجنڈہ پر یہ تجویز بھی تھی اور عجیب اتفاق ہے کہ ایجنڈہ کی کارروائی ابھی اس تجویز کے آئٹم تک پہونچی ہی تھی کہ یہ قیامت ٹوٹ پڑی اور کورٹ کی میٹنگ درہم برہم ہوگئی، لیکن بعد میں اس تجویز کو بھی منظور شدہ تسلیم کر کے ایجنڈہ کی کارروائی میں شامل کر لیا گیا۔

چونکہ یہ یونیورسٹی کے دستور کی ایک دفعہ میں ترمیم کا معاملہ تھا اس لئے اس کا نفاذ وزیٹر (صدر جمہوریہ) کی منظوری کے بغیر ہو نہیں سکتا تھا اس بنا پر یہ تجویز وزیٹر کی خدمت میں روانہ کر دی گئی اور جب وہاں سے منظوری آگئی تو اب اس ترمیم شدہ دفعہ کے ماتحت اب مجھ کو از سر نو دو برس کے لئے پھر ڈین مقرر کیا گیا، یہ دو برس کی مدت ۶۷ء میں (غالباً اپریل یا مئی میں) پوری ہوئی، اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کا ذکر آئے گا۔

نواب صاحب کے اخلاق و عادات اور کارنامے

بدقسمتی سے مسلمانوں کو وقتاً فوقتاً وزارتوں اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں اور مناصب میں ایسے مسلمانوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے جن سے اسلام کو اور مسلمانوں کو نقصان پہونچا ہے اور جو فکر و نظر اور کردار و عمل کے اعتبار سے "ننگ اسلام ہے ایسوں کا مسلماں ہونا" کا مصداق ہیں۔ اگرچہ یہ کلیہ نہیں ہے، کیونکہ آزادی سے لے کر اب تک اگر آپ شمار کریں گے تو وزیروں، سفیروں اور حکومت کے دوسرے شعبوں اور صیغوں میں ایسے مسلمان بھی اچھی خاصی تعداد میں ملیں گے جن کا اسلام اور ایمان شک و شبہ سے بلند و بالا ہے، لیکن انسان کی فطرت ہے کہ وہ اچھے لوگوں کا اتنا شکر گذار اور مداح نہیں ہوتا جتنا برے لوگوں کا شکوہ سنج اور ان سے خائف ہوتا ہے اور چند افراد کے عمل پر ایک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ کا اطلاق کر دیتا ہے، اس بنا پر چونکہ نواب علی یاور جنگ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہ چکے تھے اس لئے ان کی نسبت بھی یونیورسٹی کے اسلام پسند حلقوں میں طرح طرح کی باتیں مشہور تھیں اور انھیں مشکوک نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ لیکن میرا اپنا تجربہ، مشاہدہ اور احساس یہ ہے کہ اصل حقیقت اس سے زیادہ نہیں تھی کہ شعر:

34092

کچھ تو ہوتے ہیں محبت میں جنوں کے آثار
اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہیں

پہلی بات تو یہ ہے کہ نواب صاحب لا مذہب ہرگز نہیں تھے، ان کا خاندان علم و فضل اور مشرقی و اسلامی روایات کے اعتبار سے ممتاز رہا ہے، تجدد کا رنگ کتنا ہی گہرا ہو، لیکن اصل خوبو مٹتے ہی مٹتی ہے، مجھ سے جب کبھی ملاقات ہوتی تھی، اکثر مذہب اور تاریخ اسلام پر گفتگو کرتے تھے، قرآن مجید اور تصوف کا ذوق اچھا تھا۔ انگریزی زبان میں "تبویب القرآن" کے طرز پر ایک کتاب بھی مرتب کر رہے تھے اور کبھی کبھی اس سلسلہ میں مجھ سے مشورہ کرتے تھے۔ ۱۹۶۷ء میں جب مجھکو صدر جمہوریہ کی طرف سے عربی میں اوارڈ ملا اور ان کو اس کا علم ہوا تو فوراً ایک عنایت نامہ انگریزی میں لکھکر مجھکو گرمجوشی سے مبارک باد دی اور لکھا: میری رائے میں یہ اوارڈ آپ کو بہت پہلے ملنا چاہئے تھا، کیونکہ آپ اس کے بہمہ وجوہ مستحق تھے۔ مشہور یہ تھا کہ نواب صاحب جب جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کے وائس چانسلر تھے تو وہاں "شعبۂ دینیات" کا خاتمہ انھیں کے زمانہ میں ہوا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اول تو خاتمہ کی حقیقت کیا ہے؟ کیونکہ کلکتہ کے قیام کے زمانہ میں میں جامعہ عثمانیہ کے شعبہ دینیات کے ماتحت ایک مرتبہ ایک پی ایچ۔ ڈی کے مقالہ کا ممتحن ہوا تھا اور زبانی امتحان کے لئے حیدرآباد بھی گیا تھا۔ اور اب تو وہاں اسلامک اسٹڈیز ڈپارٹمنٹ بھی ہے جو کافی ترقی یافتہ اور کامیاب ہے۔ اور اگر یہ شعبہ ختم بھی کر دیا گیا ہے تو اس میں نواب صاحب کا دخل کہاں تک ہے، بہرحال علی گڑھ یونیورسٹی کا تو میرا اپنا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ نواب صاحب نے فیکلٹی آف

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھیالوجی کے کسی کام میں نہ صرف یہ کہ کبھی کوئی رکاوٹ نہیں پیدا کی بلکہ اس کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے رہے اور اس کی ترقی کے لئے میں نے جس کسی چیز کا مطالبہ کیا انھوں نے خوش دلی اور فراخ حوصلگی سے اس کی تائید کی۔

فیکلٹی آف تھیالوجی میں پروفیسر شپ

چنانچہ فیکلٹی آف تھیالوجی میں پروفیسر شپ ان کے عہد میں ہی منظور ہوئی، لیکن کس طرح؟ اس کی روداد بھی دلچسپ ہے سن لیجئے! جب میں نے محسوس کیا کہ فیکلٹی اب یونیورسٹی کی دوسری فیکلٹیوں کی طرح کافی منظم، مرتب اور ترقی یافتہ ہوگئی ہے تو میں نے اس میں دو پروفیسر شپ کا مطالبہ کیا اور فیکلٹی کی دوسری تجویزوں کے ساتھ یہ تجویز وائس چانسلر کے پاس بھیجدی گئی۔ ضابطہ کی خانہ پری کرنے کے بعد وائس چانسلر نے حسب قاعدہ یہ تجویز یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو روانہ کردی۔ کچھ دنوں کے بعد پنج سالہ منصوبہ کے سلسلہ میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے مطالبات کی جانچ پڑتال کی غرض سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی ایک تحقیقاتی کمیٹی آئی اور اس نے ہر فیکلٹی اور ہر شعبہ میں جاجاکر ان کے مطالبات پر گفتگو اور تحقیق کی، ایک روز یہ کمیٹی ہمارے ہاں بھی آئی اور میں نے ڈین کی حیثیت سے سنی اور شیعہ دونوں شعبوں کے اسٹاف کے ...... ساتھ کمیٹی سے بات چیت کی اور اس کو جو معلومات درکار تھیں وہ سب بہم پہونچائیں، کمیٹی نے طلبار کی تعداد، امتحانات اور ان کے نتائج پی ایچ ڈی کے طلبار کی تعداد، پیریڈ اور سالانہ بجٹ وغیرہ یہ سب دیکھنے کے بعد کہا کہ آپ کا پروفیسر شپ کا مطالبہ بجا ہے، لیکن کمیشن ایک ہی پروفیسر شپ دے سکتا ہے، دو کی گنجائش نہیں ہے، اب آپ یہ بتائیے کہ سنی یا شیعہ ان دونوں شعبوں میں سے کس شعبہ کو دی جائے۔ میں نے جواب دیا: اس معاملہ میں میری پوزیشن بہت نازک ہے، میں کچھ نہیں کہہ سکتا، اس کا فیصلہ آپ خود کیجئے۔

اس گفتگو کے بعد کمیٹی رخصت ہوگئی، دوسرے دن وائس چانسلر صاحب نے ان کی موجودگی میں کمیٹی سے گفتگو کرنے کے لئے تمام فیکلٹیوں کے ڈین صاحبان کو مدعو کیا۔ میں بھی اس میٹنگ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موجود تھا، جب میری باری آئی تو میں نے فیکلٹی کی تجویز کے مطابق دو پروفیسر شپ پر ہی اصرار کیا۔ لیکن کمیٹی نے اب بھی وہی بات کہی جو مجھ سے پہلے کہی تھی اور دریافت کیا کہ یہ ایک پروفیسر شپ کس شعبہ کو دی جائے۔ میں نے اسی پہلے جواب کا اعادہ کیا تو وائس چانسلر نے مجھ سے فرمایا: آپ ڈین کی حیثیت سے بتا سکتے ہیں کہ دونوں شعبوں میں سے کونسا شعبہ پروفیسر شپ کے لئے قابل ترجیح ہے۔ میں نے عرض کیا: میں بتا سکتا ہوں لیکن بتانا نہیں چاہتا۔ مجھکو اس امر میں بالکل معذور سمجھئے۔ میرے اس جواب کے بعد وائس چانسلر صاحب نے سرگوشی کے انداز میں کمیٹی کے ممبروں سے کوئی بات کہی جس کو میں فاصلہ پر ہونے کے باعث سن نہیں سکا اور اب میرا کام ختم ہوگیا۔ میٹنگ سے باہر نکلنے کے بعد کامرس اور قانون کے پروفیسر صاحبان جو میرے بے تکلف عزیز دوست تھے انھوں نے مجھ سے شکایت کی کہ میں نے متعین طور پر کسی شعبہ کا نام کیوں نہیں لیا، اور میں کیوں شرما گیا۔ میں نے کہا: آپ کی شکایت بجا ہے، لیکن میرا ضمیر اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔

کمیٹی اپنا کام ختم کر کے چلی گئی اور اس نے اپنی سفارشات کے ساتھ رپورٹ کمیشن کو پیش کر دی، نتیجہ یہ ہوا کہ جب کمیشن کی طرف سے یونیورسٹی کی دوسری فیکلٹیوں کے مطالبات کے متعلق اس کے فیصلوں کا اعلان ہوا تو اس نے فیکلٹی آف تھیالوجی کو بھی ایک پروفیسر شپ دے دی اور کسی شعبہ کا خود کوئی تعین نہیں کیا۔ اسے یونیورسٹی کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ اس طرح اللہ کا شکر ہے فیکلٹی کو پروفیسر شپ، علاوہ اور چند جگہوں کے مل گئی اور اس میں شبہ نہیں اس میں جناب نواب صاحب کی ہمدردی اور توجہ کو بڑا دخل ہے۔ لیکن ابھی معاملہ یہیں تک پہونچا تھا کہ میری ڈین شپ کے دو برس پورے ہوگئے اور مولانا سید علی نقی النقوی ڈین مقرر ہو گئے اور ادھر جناب نواب صاحب اپنے عہدہ سے قبل از وقت سبکدوش ہو کر علی گڑھ سے تشریف لے گئے اور پروفیسر عبدالعلیم وائس چانسلر ہو گئے۔ اب کمیشن کے فیصلہ کو بروئے کار لانے کا وقت آیا تو وائس چانسلر نے مولانا سید علی نقی صاحب کو لکھا کہ فیکلٹی آف تھیالوجی کے پروفیسر کی پوسٹ کا اعلان کرنا ہے، آپ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس کے لئے ضروری شرائط لکھکر بھیجدیجئے۔ مولانا کو دوسرے بہت سے حضرات کی طرح اس بات کا یقین تھا کہ یہ پروفیسر شپ سنی دینیات کے حصہ میں ہی آئے گی، اسی بنا پر اصل بات کا جواب دینے کے بجائے انھوں نے لکھا کہ یہ پروفیسر شپ ایک ہی شعبہ کو مل سکتی ہے دوسرا شعبہ اس سے محروم رہے گا اور اس کی وجہ سے ملک میں سنی شیعہ کی بحث پیدا ہو جائے گی اور یہ چیز یونیورسٹی کی روایات اور اس کی شہرت و وقار کے منافی ہوگی، اس بنا پر بجائے ایک کے دو پروفیسر شپ ہونی ضروری ہیں" مولانا کا منشا یہ تھا کہ ہوں تو دو ہوں، ورنہ اس ایک جگہ کو خالی رکھا جائے گویا وہی مثل ہوئی: "یا کھائیں گے گھی سے، نہیں تو جائیں گے جی سے" مجکو معلوم تھا کہ کیا کاروائی ہو رہی ہے، لیکن جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا۔ میں اس قسم کی چیزوں سے جو عہدہ و منصب سے تعلق رکھتی ہوں کبھی دلچسپی نہیں لیتا۔ چنانچہ اس معاملہ میں بھی میں بالکل خاموش اور الگ تھلگ رہا۔ مولانا علی نقی صاحب سے اس موضوع پر کبھی کوئی بات ہی نہیں کی۔ اسی طرح علیم صاحب کو نہ کوئی تحریر بھیجی، نہ خط لکھا اور نہ زبانی کچھ کہا اور نہ کسی اور سے اس کا تذکرہ کیا۔

بہرحال علیم صاحب نے مولانا سید علی نقی صاحب کے خط کا اثر لیا ــــ اور ایک مرتبہ رجسٹرار صاحب سے گفتگو کے دوران میں یہ بھی کہا کہ میں کیا کروں! یہ سب کیا کرایا تو اکبر آبادی صاحب کا ہی ہے۔ اگر وہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی کمیٹی سے یہ کہدیتے کہ پروفیسر شپ سنی دینیات کو چاہئے تو یہ سارا خرخشہ ہی کیوں پیدا ہوتا مگر اس وقت وہ (اکبر آبادی) اپنے حسن اخلاق اور مروت کا شکار ہو گئے ــــ چنانچہ علیم صاحب نے یہ کیا کہ اب جو اکزکٹو کونسل کی میٹنگ ہوئی اس میں یہ تجویز پیش کر دی کہ اکبر آبادی اور مولانا علی نقی دونوں کو شخصی طور پر پروفیسر مقرر کیا جاتا ہے اور یہ تجویز باتفاق آرا منظور ہو گئی، لیکن جب یہ تجویز منظوری کے لئے گرانٹس کمیشن کو بھیجی گئی تو اس نے اس پر اعتراض کیا اور اس کی وجہ یہ لکھی کہ (۱) پروفیسر شپ تو ایک منظور ہوئی ہے، دوسری پروفیسر شپ کی تنخواہ کہاں سے آئے گی اور (۲) دوسری وجہ یہ لکھی کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی بالکل واضح ہدایت ہے کہ کسی پروفیسر کا تقرر اخبارات میں پوسٹ کے اشتہار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور پھر اس کے بعد سلکشن کمیٹی کے بغیر ہرگز نہیں ہوسکتا۔ علیم صاحب کے سامنے جب کمیشن کا یہ خط پیش ہوا تو انھوں نے اس کے جواب میں رجسٹرار کو اس مضمون کا خط بھیجنے کی ہدایت کی کہ پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ آپ نے ایک پروفیسر کی تنخواہ کے لئے جو رقم منظور کی ہے ہم نے اسی رقم کو دونوں پر تقسیم کر دیا ہے اور ہم نے حساب لگا کر دیکھ لیا ہے کہ یہ رقم کافی ہو جائے گی، مزید درکار نہ ہوگی، اب رہا دوسرا اعتراض! تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ دونوں شخص غیر معمولی شہرت اور قابلیت کے لوگ ہیں چنانچہ جب ریڈر کی پوسٹ پر ان کا تقرر ہوا تھا تو اس وقت بھی ان کی درخواست کے بغیر ان کو یہ پوسٹ پیش کی گئی تھی، اس لئے اب بھی ان کو اس قاعدہ اور ضابطہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

یونیورسٹی کے اس خط کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کو اطمینان ہو گیا، اس نے اپنا اعتراض واپس لے لیا اور اکزکٹو کونسل کے رزولیوشن کی منظوری بھیجدی۔ اب ہم دونوں پروفیسر ہو گئے تھے۔ لیکن میں اپنی بات کہتا ہوں کہ مجکو اس طرح پروفیسر ہونے کی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنا رنج اور افسوس اس بات سے ہوا کہ یہ پروفیسر شپ محض شخصی اور ذاتی تھی، یعنی ہم دونوں کی ریڈر کی پوسٹ کو بڑھا کر (upgrade) پروفیسر کی پوسٹ کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک شخص کا ذاتی اعزاز و اکرام ضرور ہے لیکن اس سے ستی اور شعبہ دونوں میں کسی شعبہ کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یہ فائدہ اس وقت ہوتا جب کہ ہمارے پروفیسر ہو جانے سے ہماری ریڈر کی پوسٹ قائم رہتی اور ان پر کسی کا تقرر ہوتا۔ اور اس طرح ہر شعبہ کو ایک ایک ریڈر مل جاتا۔ بدر الدین طیب جی اس بات کی گواہی دے سکتے ہیں کہ ایک مرتبہ جب انھوں نے اسی طرح شخصی طور پر پروفیسر بنانا چاہا تو میں نے بلا تامل شکریہ کے ساتھ اس سے انکار کر دیا۔ اور عرض کیا کہ میں اپنا ذاتی فائدہ نہیں بلکہ فیکلٹی کا فائدہ چاہتا ہوں اس لئے آپ فیکلٹی میں پروفیسر کی مستقل پوسٹ قائم کرائیے۔ اگر وہ ہوتی ہے تو سبحان اللہ! ورنہ مجکو اس کی ضرورت نہیں۔ بدر الدین طیب جی اس سلسلہ میں تحریک کرنا چاہتے ہی تھے کہ وہ یہاں سے رخصت ہو گئے، اب دیکھ لیجئے ہم دونوں کے

© rasailojaraid.com

شخصی طور پر پروفیسر ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ہٹتے ہی فیکلٹی پھر وہیں لوٹ گئی جہاں پہلے تھی، یعنی سنی اور شیعہ میں ایک ایک ریڈر اور باقی سب لکچرر، پروفیسر ندارد۔ پوری یونیورسٹی میں تنہا یہی ایک فیکلٹی ہے جس کے اسٹاف کی یہ نوعیت ہے، ۷۲ء ایکٹ کے سلسلے میں گورنمنٹ کو اسلامیات نوازی کے بڑے بڑے بلند بانگ دعاوی ہیں، لیکن جب فیکلٹی آف تھیالوجی کا یہ عالم ہو تو پھر ان دعاوی میں کیا وزن باقی رہتا ہے؟ بہرحال مولانا سید علی نقی صاحب خوش ہوں گے کہ وہ دو برس کے لئے ڈپین ہوئے تھے تو اس سے انھوں نے یہ فائدہ حاصل کر لیا کہ آئے تھے ریڈر ہو کر اور یہاں سے گئے پروفیسر ہو کر! لیکن میرے دل میں اس کی جو خلش ہے وہ اب تک دور نہیں ہوئی۔

وللناس فیما یعشقون مذاہب

نواب صاحب سے ۲۵ اپریل والے واقعہ کے سلسلہ میں جو غلطی یا بھول چوک ہوئی وہ ہوئی لیکن جہاں تک کہ یونیورسٹی کے اسلامی کردار کا تعلق ہے میں نے کبھی محسوس نہیں کیا کہ نواب صاحب نے اس کو کلاً یا جزءً اس کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہو، یونیورسٹی کی جو روایات اب تک چلی آرہی تھیں وہ ان کے عہد میں بھی قائم اور برقرار رہیں اور یونیورسٹی کی ملازمت اور طلباء میں مسلمانوں کا جو تناسب پہلے تھا اس میں بھی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی، نواب صاحب صرف نام کے نہیں بلکہ حقیقۃً نواب تھے، زندگی بڑے ٹھاٹھ سے بسر کرتے تھے، لیکن تھے بڑے خلیق، ملنسار اور خوش طبع، ہر شخص ان کے پاس بے تکلف آجا سکتا تھا اور وہ ہر شخص سے اس کی طرف پورے طور پر متوجہ ہو کر گفتگو کرتے اور اس کی بات سنتے تھے، وائس چانسلر کی حیثیت سے اپنے مفوضہ فرائض و واجبات بڑی سوجھ بوجھ اور محنت و استقلال کے ساتھ انجام دیتے تھے، میں نے بارہا دیکھا ہے کہ رات کو دس گیارہ بجے تک کسی میٹنگ میں بیٹھے ہیں یا رجسٹرار وغیرہ کو لئے فائل دیکھ رہے ہیں۔

لازمین یونیورسٹی کے لئے ایوننگ کالج

نواب صاحب نے یونیورسٹی میں جو اصلاحات کیں ان میں ایوننگ کالج کا قیام خاص طور پر بہت اہم ہے، نواب صاحب نے یہ محسوس کیا کہ یونیورسٹی کے بنیادی طور پر عناصر ترکیبی دو ہی ہیں ایک اساتذہ اور دوسرا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انتظامیہ (Administrative staff) لیکن ان دونوں میں یہ فرق بہت نمایاں ہے کہ اساتذہ کے لئے ترقی کے بڑے سے بڑے مواقع ہیں، جو شخص آج لکچرر ہے کل وہ ریڈر اور پرسوں پروفیسر ہو سکتا ہے، کسی اور بڑی پوسٹ پر بھی جا سکتا ہے۔ لیکن انتظامیہ کے لوگوں کے لئے اس طرح کی ترقی کے لئے کوئی موقع نہیں ہے۔ علاوہ ازیں جس قدر محنت اور جاں نشانی یہ لوگ کرتے ہیں تعلیمی اسٹاف نہیں کرتا۔ گویا یونیورسٹی اگر ایک مشین ہے تو اس کے کل پرزے یہی لوگ ہیں، لیکن محض تعلیمی سندات میں کمتر ہونے کے باعث ان کی آج وہ گت ہے جو قابل رحم ہے، ان امور کے پیش نظر نواب صاحب نے ان ملازمین کے لئے ایک ایوننگ کالج کا اجرا کیا جس میں آرٹس، کامرس وغیرہ سب کی تعلیم بی۔ اے تک ہوتی ہے، اس کے بعد اگر کوئی ایم اے یا ایم کام کرنا چاہے تو ملازمت کے ساتھ وہ بھی کر سکتا ہے، اس کالج کا فیض عام اور عظیم ہے۔ کل جو کلرک صرف ہائی اسکول تھے آج وہ ایم۔ اے، ایم کام، یا ال۔ ال۔ بی ہیں اور ترقی کے راستہ پر گامزن ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کام رفاہ عام کا ہے، لیکن میں نے اس چیز کو کبھی پسند نہیں کیا اور ایک مرتبہ اکاڈمک کونسل کی میٹنگ میں میں نے اس کے خلاف تقریر بھی کی تھی، میرا خیال یہ ہے کہ اس کالج کے ذریعہ افراد و اشخاص کو فائدہ پہونچ رہا ہے، لیکن یونیورسٹی کا نقصان ہو رہا ہے، کیونکہ جو کلرک صبح ½ ۹ بجے سے شام ۵ یا پانچ بجے تک دفتر میں بیٹھ کر کام کرے گا اور اس کے بعد فوراً پانچ بجے سے رات کے آٹھ نو بجے تک کالج میں تعلیم حاصل کرے گا اس سے یہ توقع بمشکل کی جا سکتی ہے کہ وہ دفتر کا کام یکسوئی، محنت اور حاضر حواسی کے ساتھ کرے گا۔ میں نے بعض کلرکوں کو دیکھا ہے کہ وہ دفتر کے اوقات میں بھی کورس کی کتابیں لئے بیٹھے رہتے ہیں، علاوہ ازیں جب وہ اس قدر محنت کریں گے تو ان کی دماغی اور جسمانی صحت کا کیا عالم ہوگا؟ بلکہ میں نے اکاڈمک کونسل کے جلسہ میں یہ بھی کہا تھا کہ اس کالج نے کلرکوں کی ازدواجی زندگی کو بھی سخت متاثر کیا ہے، اور گھروں میں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔

سمسٹر سسٹم نواب صاحب کی دوسری اہم اصلاح سمسٹر سسٹم کا اجراء ہے، یہ سسٹم امریکہ کی پیداوار اور وہاں کے نظام تعلیم کا جزو لاینفک ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ طالب علم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی واقفیت لگے بندھے چند مضامین کے دائرہ کے اندر محدود و مقید نہ رہے۔ بلکہ اس کے سامنے مضامین وموضوعات کا ایک نہایت وسیع میدان ہو اور اس کو اس امر کی پوری آزادی ہو کہ وہ اپنے رجحان اور فطری استعداد وصلاحیت کے مطابق جو مضامین چاہے اختیار کرلے۔ علاوہ ازیں آج کل کا زمانہ سائنس اور ٹکنالوجی کا ہے۔ ہر شخص کا رجحان انھیں کی طرف ہے، لیکن اب تجربہ کے بعد یہ بات تسلیم کرلی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص صرف سائنس اور ٹکنالوجی کا ہو جائے اور علوم انسانیت (Humanities) میں سے کسی علم کے ساتھ اس کا واسطہ نہ ہو تو وہ صرف ایک مشین بن کر رہ جائے گا اور انسانیت کے اقدار عالیہ جن پر تہذیب وثقافت اور زندگی میں شائستگی وخوش مذاقی کا دار ومدار ہے ان سے اس کو بُعد رہے گا۔ اسی طرح اگر ایک شخص محض علوم انسانیت کا طالب علم ہو اور سائنس سے بالکل لاعلم اور ناواقف ہو تو اس میں تہذیب اور ثقافت ضرور ہوگی، لیکن دنیا کی ترقی اور کائنات کی وسعت وگیرائی کا محرم راز نہ ہوگا۔ اس بناپر ضروری ہے کہ سائنس اور علوم انسانیت ان دونوں کو خلط ملط کردیا جائے، چنانچہ کسی نے تعلیم کی بڑی اچھی اور جامع تعریف کی ہے کہ: To Know every thing about Something and Some thing about every thing

یعنی ایک چیز کے متعلق سب کچھ جاننا اور ہر چیز کے متعلق کچھ کچھ جاننا۔ سمسٹر سسٹم کی بنیاد اسی اصول پر ہے، چنانچہ اس کے ماتحت ایک مضمون خاص ہوتا ہے جس میں طالب علم کو تکمیل کرنی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ دوسرے مضامین بطور توابع (Subsidiary Subjects) کے ہوتے ہیں۔ پھر پرانا سسٹم حصولی (Receptive) زیادہ تھا اور تخلیقی (creative) کم۔ سمسٹر سسٹم اس کا الٹ ہے۔ اس سسٹم کے ماتحت طالب علم کو ہر مضمون سے متعلق بار بار کتابوں کا مطالعہ کرکے مضامین لکھنے ہوتے ہیں جن کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ ان پر اس کو نمبر دیے جاتے ہیں اور یہ نمبر سالانہ امتحانات میں محسوب ہوتے ہیں، اس سسٹم کے ماتحت امتحانات کا پرانا طریقہ بھی تبدیل ہوجاتا ہے، ایک تعلیمی سال کو دو ٹرم پر تقسیم کرتے ہیں اور ہر ٹرم کے خاتمہ پر اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا امتحان ہوتا ہے، اس طرح پورا امتحان بیک وقت نہیں، بلکہ بتدریج ہوتا ہے اور ہر ٹرم کے امتحان کے بعد ہر طالب علم کو یہ معلوم رہتا ہے کہ وہ کہاں ہے اور اس کی ترقی کی رفتار کیا ہے، اگر اس میں کوئی خامی یا کمی ہوتی ہے تو وہ باقی ٹرموں کے امتحان کے لئے زیادہ مستعدی اور توجہ سے تیاری کرتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ ہر ٹرم کے سب پرچوں میں وہ شریک ہی ہو۔ اگر کسی ایک پرچے میں خاطر خواہ تیاری کے نہ ہونے یا کسی اور مجبوری کے باعث وہ شریک نہیں ہوسکا ہے تو اسے اختیار ہے کہ آیندہ سال کے یا اس کے بعد اس ٹرم کے اس پرچہ میں شریک ہو۔ اسی طرح ٹرموں میں ترتیب بھی ضروری نہیں ہے وغیرہ وغیرہ، غرض کہ اس سسٹم کے ماتحت مضامین میں غیر معمولی وسعت کے ساتھ امتحانات میں اس درجہ نرمی اور لچک ہے کہ اگر اب بھی کوئی طالب علم ناکام ہوتا ہے یا اس کا ڈویژن اچھا نہیں ہے تو اس کو طالب علم کی بد قسمتی کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا اور اس طالب علم سے آیندہ کوئی توقع نہیں کی جاسکتی۔

ملک میں جو تعلیمی تجربے ہو رہے ہیں ان کی وجہ سے ماہرین تعلیم کا عام رجحان اس سسٹم کی طرف روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا جارہا تھا، نواب علی یاور جنگ نے اس کو بھانپ لیا اور ان کو اس کا ارمان پیدا ہوا کہ ان کے عہد میں اور ان کی سربراہی میں یہ سسٹم جلد از جلد یونیورسٹی میں جاری ہوجائے، تاکہ اس معاملہ میں اولیت کا سہرا دو ایک یونیورسٹیوں کی طرح مسلم یونیورسٹی کے بھی سر رہے، چنانچہ انھوں نے اپنی تمام تر توجہات اس پر مرکوز کر دیں، اس مقصد کے لئے ہر فیکلٹی میں کمیٹیاں بنیں، ایک بڑی کمیٹی بنی جو سب پر مشتمل تھی اور ہر چیز میں نہایت عجلت سے کام لے کر اس اسکیم کو جھٹ پٹ نافذ کر دیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس اسکیم کا اصل مصنف امریکہ ہے اور وہاں اور کینیڈا وغیرہ میں یہ بہت کامیاب ہے۔ اس کامیابی کی وجوہ یہ ہیں کہ (۱) ان لوگوں کے پاس فنڈ کی کوئی کمی نہیں۔ یہ لوگ تعلیم پر بے تحاشا خرچ کرتے ہیں (۲) ان ملکوں کے طلبا صحیح معنی میں طالب علم ہوتے ہیں، دل لگا کر پڑھتے اور اپنے مضمون کا ذوق رکھتے ہیں، وہاں اعلیٰ تعلیم برائے فیشن نہیں (۳) وہاں کے اساتذہ بے حد محنتی، اپنے فن کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ماہر اور مخلص ہوتے ہیں اور ساتھ ہی ایماندار اتنے کہ امتحان میں ان کا بیٹا بیٹا ہو یا دشمن کا بیٹا بہرحال اس کو نمبر اتنے ہی ملیں گے جن کا وہ حقدار ہے، اس سے نہ ایک نمبر کم اور نہ ایک نمبر زیادہ! اس کے برخلاف بدقسمتی سے ہمارے ہاں ان تینوں چیزوں میں سے ایک چیز بھی نہیں ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ کی نقالی میں اپنے ملک اور اپنے سماج کے حالات سے صرف نظر کرکے یہ سسٹم جاری تو کر دیا گیا ہے، لیکن بجائے فائدہ کے نقصان پہونچ رہا ہے، تعلیمی اسٹنڈرڈ گر گیا ہے، اور اس کا اعتبار کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس سسٹم کے ماتحت ہر مضمون کا امتحان داخلی بھی ہوتا ہے اور خارجی (Internal and External assesment) بھی، لیکن یہ بارہا دیکھا گیا ہے کہ جو طالب علم خارجی امتحان میں 30 فی صد نمبر حاصل کرتا ہے وہی داخلی امتحان میں 70 فی صد نمبر حاصل کر لیتا ہے، علاوہ ازیں اس سسٹم میں ابھی تک کچھ ایسی پیچیدگیاں ہیں جو اب تک دور نہیں ہو سکی ہیں، اس بنا پر اس اسکیم کے جاری ہونے کے دو برس بعد ہی یونیورسٹی کے اساتذہ کا ایک بڑا طبقہ اس کا سخت مخالف ہو گیا تھا اور وہ اکاڈمک کونسل میں اس کو ختم کرنے کا رزولیشن لانے والا تھا۔ لیکن وائس چانسلر (ڈاکٹر عبدالعلیم) نے اپنا ذاتی اثر و رسوخ استعمال کرکے کسی مصلحت سے اسے رکوا دیا، علی گڑھ کے بعد اس سسٹم کا اجرا دہلی یونیورسٹی میں بھی ہوا اور وہاں بھی اس کا حشر وہی ہوا جو علی گڑھ میں ہو چکا ہے۔ دلی یونیورسٹی میں بھی اساتذہ اور طلبا کی ایک بڑی تعداد اس سسٹم کے ختم کر دینے کے حق میں ہے۔ اس شور و غوغا کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو یونیورسٹیاں اس سسٹم کو اپنے ہاں رائج کرنے کا ارادہ کر رہی تھیں وہ چپ سادھ بیٹھ گئی ہیں۔

© rasailojaraid.com